ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

حیات، علمی و ادبی خدمات

اور

اردو تحریک سے ان کی عملی وابستگی

پہلا یادگاری خطبہ ۱۹۹۸ء

از

پروفیسر نثار احمد فاروقی

دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر اہتمام

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی، لکھنؤ

پہلا ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی یادگاری خطبہ

۱۹۹۸ء

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

حیات، علمی و ادبی خدمات

اور

اردو تحریک سے ان کی عملی وابستگی

از

پروفیسر نثار احمد فاروقی

دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر اہتمام

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی، لکھنو

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی مرحوم

کے

فرزندِ سعاد تمند ، مجاہد اردو

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم

کے نام

جنھوں نے اپنے والد محترم کی روایت کو اپنے
آخری سانس تک زندہ رکھا

از دل نرودانچہ کہ از دیدہ برفت
از دیدہ برفتہ او و در دل ماندہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلّی علیٰ رسولہِ الکریم و آلہِ واصحابہِ اجمعین

تمہید

یہ خطبہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی مرحوم کی علمی و ادبی خدمات اور اردو کی تعلیم و تحریک سے ان کی گہری دلچسپی کا ایک سرسری جائزہ ہے جس سے اتنا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے کہ مرحوم کی پوری زندگی ایک بلند نصب العین کے ساتھ علم اور تعلیم کے علاوہ اردو زبان کی بقا اور تحفظ کے لئے وقف تھی۔ وہ اس راز کے شناسا تھے کہ کسی زبان کا مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ سرکاری دفتر اس زبان میں درخواستیں قبول کرتے ہیں یا نہیں، وہ سائن بورڈوں پر نظر آتی ہے یا نہیں، اس کے اخباروں کو اشتہارات ملتے ہیں یا نہیں ملتے، عام آدمی شاید مسئلے کو اتنا ہی سمجھتا ہو، مگر جو دانائے اسرار ہیں، قوموں کی ثقافتی تاریخ اور ان کے عروج و زوال کے اسباب اور علتوں پر نظر رکھتے ہیں وہ اسے قوموں کی موت اور زندگی، ان کی فنا و بقا اور معاشرت میں ان کے وجود اور نفوذ کا مسئلہ سمجھتے ہیں ڈاکٹر سندیلوی صاحب انہیں ذی ہوش اور دوربیں انسانوں میں سے تھے جنہیں حق الیقین کے درجے میں معلوم تھا کہ ہمارا تہذیبی وجود اردو زبان میں اسی طرح بند ہے جیسے قدیم داستانوں میں کسی دیو کی جان کسی توتے میں بند ہوتی تھی اردو کو ختم کرنا ہمارے تہذیبی اور ثقافتی وجود کے خاتمے کی طرف پہلا قدم ہے اسی لئے وہ ساری عمر اپنی آواز بلند کرتے رہے اور اردو والوں کو اس مسئلے کی اہمیت جتاتے رہے انھوں نے اس تحریک کو کس طرح

قدم بہ قدم آگے بڑھایا اس کی کچھ روداد آگے بیان ہوگی، سلسلۂ گفتگو کو قائم رکھنے کے لئے ہم نے اس خطبے کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

پہلا حصہ : مختصر حالاتِ زندگی

دوسرا حصہ : تصانیف

تیسرا حصہ : اردو زبان کی تدریس اور اس کی بقا و تحفظ کے لئے جدوجہد۔

جیسا کہ میں نے ابتدا ہی میں عرض کیا، سرسری ہونے کا سبب یہ کہ میں اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے اس موضوع کا حق ادا کرنے کے لئے وقت نہیں دے سکا، دوسرے اس لیکچر کے لئے جتنے مآخذ کی ضرورت تھی وہ میرے پاس نہیں تھے، میں اپنے محترم دوست شفاعت علی صدیقی صاحب اور ڈاکٹر انیس اشفاق صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے معلومات فراہم کرنے میں میری مدد فرمائی۔

۳۰ر مارچ ۱۹۹۸ء

نثار احمد فاروقی

RUDAULI COLLECTION

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی مرحوم کا آبائی وطن مشرقی یوپی کا ایک قدیم اور مردم خیز قصبہ سندیلہ تھا جو ہند اسلامی ثقافت کے ایسے خطوں میں سے ایک ہے جس نے ماضی میں ممتاز علماء اور نمایاں شخصیات کو جنم دیا ہے۔ سندیلہ کے نام سے میرا سب سے پہلا تعارف ۱۹۴۷ء سے بھی کئی سال پہلے اس نسبت سے ہوا تھا کہ مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ عبد الرحمٰن صدیقیؒ جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے شاگرد اور حضرت حاجی امداداللہ فاروقی مہاجر مکیؒ سے بیعت تھے۔ سندیلہ ہی ان کا آبائی وطن تھا، وہ ڈابھیل اور مرادآباد کے اسلامی مدرسوں میں استاد رہے، آخری زمانہ امروہہ میں گزارا، وہیں انتقال ہوا، اور جامع مسجد امروہہ میں حضرت مولانا احمد حسن محدث امروہویؒ کے جوار میں ان کا مرقد بنا۔ حافظ صاحب کی شخصیت کا جو اثر تھا اور ان سے محبت کا جو تعلق تھا اس کی وجہ سے سندیلہ بھی میرے لئے ایک مانوس نام ہو گیا تھا۔

ومن مزھبی حبَّ الدیار لأھلھا
وللناس فیما یعشقون مذاھب

پھر ذرا سا ہوش سنبھالا تو سندیلے کے لڈوؤں سے واسطہ پڑا، یاد نہیں پہلی بار کون یہاں کے لذیز اور خوشنما لڈو ایک لال کپڑے یا کاغذ سے لپٹی ہوئی کوری ٹھلیا میں لے کر آیا تھا ان لڈوؤں نے سندیلہ کے تصور میں شیرینی بھی شامل کر دی۔

اس کے بعد کتاب سے کچھ ربط پیدا ہوا تو سب سے پہلے مولوی مظہر علی سندیلوی کا روزنامچہ نظر سے گذرا جس کی تلخیص پروفیسر نورالحسن ہاشمی

نے شائع کی تھی، اسے میں نے بہت دلچسپی سے پڑھا تھا اور ایک بار سے زیادہ پڑھا تھا۔ اسی سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ پروفیسر نورالحسن ہاشمی صاحب بھی سندیلہ کے نورتنوں میں سے ہیں۔

اسی طرح راجا درگا پرشاد مہر کی کتابیں اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، وجاہت علی سندیلوی اور ڈاکٹر سلام سندیلوی کی تصانیف نے اس تعلق اور تعارف کو مزید گہرائی بخشی۔

ڈاکٹر شجاعت علی صدیقی صاحب سے کب تعارف ہوا، یہ اب اچھی طرح یاد نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے فروغ اردو کے جگر نمبر کے لئے مجھ سے مضمون طلب کیا تھا اور وہ میں نے بھیجا بھی تھا پھر وہ جگر نمبر شائع بھی ہوا تھا۔ یہ قصہ ۱۹۶۱ء کا ہے۔ فروغ اردو کے لئے ان کی فرمائش پر چند اور مضامین بھی لکھے تھے ان میں سے "تلامذہ مصحفی" پر ایک مضمون تو کئی قسطوں میں چھپا تھا اس وقت یہ بتانے سے قاصر ہوں کہ وہ مضامین ۱۹۶۱ء سے پہلے شائع ہوئے یا بعد میں۔ اس وقت تک ڈاکٹر سندیلوی صاحب سے شخصی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میرا لکھنؤ کا پہلا سفر ۱۹۶۳ء میں ہوا تھا۔ اسی زمانے میں ڈاکٹر سندیلوی صاحب سے ادارہ فروغ اردو لکھنؤ میں یا دانش محل میں ملاقات ہوئی۔ ایک دو بار لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بھی ان سے ملنا ہوا، اس کے بعد جب بھی لکھنؤ آنا ہوا ڈاکٹر سندیلوی صاحب کے دولت کدے پر تو کبھی حاضری کا شرف نصیب نہیں ہوا مگر وہ فروغ اردو میں یا دانش محل میں ضرور مل جاتے تھے۔ میں نے انہیں ہمیشہ ایک ہی وضع میں دیکھا، ہمیشہ نہایت تپاک اور محبت سے ملے۔ اس کے باوجود ان سے

بہت زیادہ قربت مدت تک نہ ہو سکی۔ جب ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم اور محترم شفاعت علی صدیقی صاحب سے تعارف ہوا اور ان دونوں حضرات کے اوصاف کا طبیعت پر خاص اثر مرتب ہوا تو اب ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی صاحب سے بھی خاموش محبت کا تعلق پیدا ہو گیا۔ ان کا دہلی آنا کم ہوتا تھا اسی طرح مجھے سال میں ایک آدھ بار ہی لکھنو آنے کی توفیق ہوتی اس لئے کبھی ان سے طویل صحبت اور گفتگو کا موقع نہیں ملا۔

ان کی تصانیف میں بیشتر کتابوں کے نام کا تو علم تھا مگر میں نے صرف ان کی ایک ہی کتاب "الطاف حسین حالی بہ حیثیت شاعر" پڑھ رکھی تھی، دوسری کوئی کتاب پڑھی بھی ہو تو اب یاد نہیں۔ حالی پر ان کی اس کتاب نے مجھے کیسا متاثر کیا اس پر آگے چل کر گفتگو کروں گا۔

ڈاکٹر سندیلوی صاحب کی دوسری کتابوں کو دیکھنے اور پڑھنے کا موقع اب ملا جب کہ ڈاکٹر انیس اشفاق صاحب اور برادر محترم شفاعت علی سندیلوی نے اس لکچر کی دعوت دی اور اس کے لئے کچھ بنیادی Material بھی فراہم کر دیا۔

جیسا کہ میں نے تمہید ہی میں عرض کیا تھا اس لکچر کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا حصہ ڈاکٹر سندیلوی صاحب کے سوانح سے متعلق ہے دوسرا ان کی تصانیف سے اور تیسرے حصے میں سرسری طور پر ہی سہی یہ بتایا گیا ہے کہ اردو زبان کے فروغ اور تحفظ کے لئے انہوں نے ساری عمر کیسی بے لوث اور مسلسل عملی خدمت انجام دی ہے۔

(۱)

ڈاکٹر سندیلوی صاحب کی زندگی اور ادبی خدمات پر ایک ایم ۔ اے کا Dissertation لکھنؤ یونیورسٹی کی طالبہ عارفین بانو نے ڈاکٹر انیس اشفاق کی نگرانی میں لکھا تھا جو ۱۹۹۵ء میں شائع بھی ہو چکا ہے ۔اسے پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ بہت سلیقے سے لکھا گیا ہے اور اس میں تقریباً سارے ضروری مباحث کا احاطہ کر لیا گیا ہے ، ورنہ ایم۔اے کے مقالے اتنی احتیاط اور توازن کے ساتھ کم ہی لکھے جاتے ہیں ۔ڈاکٹر سندیلوی کے حالات سے واقفیت کے لئے یہ کتاب بہت اہم ہے اور مستند بھی اس لئے کہ اس کی نگرانی ڈاکٹر انیس اشفاق جیسے دیدہ ور استاد نے کی ہے اور اس لئے کہ جب یہ مقالہ لکھا گیا ہے تو ڈاکٹر سندیلوی صاحب حیات تھے اور ظاہر ہے مصنفہ نے بہت سی باتیں ان سے دریافت کر کے ہی لکھی ہوں گی ۔ تیسری بات یہ کہ اس میں ڈاکٹر سندیلوی صاحب کی تقریباً کل تصانیف اور مرتبہ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے اس کے علاوہ ان کے بارے میں جو مضامین یا خاص نمبر وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ان میں سے بیشتر اب عام دسترس میں بھی نہیں ہیں ۔ وہ بھی سوانح نگار کے سامنے رہے ہیں ۔

لیکن عارفین بانو کے اس مقالے سے پہلے خود ڈاکٹر سندیلوی نے اپنے حالات خاصی تفصیل اور وضاحت سے ۱۹۹۳ء میں لکھے تھے جو اسی سال ماہ جولائی کی اشاعت میں رسالہ نیا دور لکھنؤ نے "میری رودادِ حیات" کے عنوان سے شائع کئے تھے ۔

ایک طویل انٹرویو ڈاکٹر آصفہ زمانی صاحبہ نے لیا تھا جو اخبار قومی آواز لکھنؤ میں شائع ہوا تھا۔ان میں جو تفصیل آگئی ہے اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں صرف اختصار کے ساتھ ایک بنیادی خاکہ پیش کرنا مناسب ہوگا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ڈاکٹر سندیلوی صاحب کی ولادت ۱۹۱۶ء کی ہے اور انہیں اعداد سے تاریخ بھی معلوم ہو جاتی ہے ۔یعنی یکم ستمبر ۱۹۱۶ء۔ اگر آپ تاریخ کے لئے ایک کا ہندسہ لکھیں مہینے کے لئے ۹ کا ہندسہ لکھیں تو ۱۶۔۹۔۱ تاریخ ولادت ہو جاتی ہے۔

ان کے والد عنایت علی صاحب کو آپریٹو بینک میں ملازم تھے ان کی وفات ۱۹۶۶ء میں ہوئی تھی۔ہر بڑے آدمی کی ماں ہی اس کی سب سے بڑی خیر خواہ ، مربّی اور رہنما ہوتی ہے ،جس کی خاموش خدمت کا کبھی احساس بھی نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر سندیلوی صاحب کا بیان ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت اور ذہنی ساخت پرداخت میں ان کی والدہ محترمہ کا بڑا حصہ ہے ۔آپ کی تعلیم کا آغاز قرآن شریف کی ناظرہ خوانی سے ہوا، پھر قرآن کریم حفظ کرنا شروع کیا، مگر اچانک سر میں چوٹ لگ جانے کی وجہ سے حفظ پورا نہ کر سکے۔

پہلے سندیلہ کے پرائمری اسکول میں داخلہ لیا ۔یہاں سے کچھ عرصے کے بعد کاکوری جانا پڑا اور وہاں ورناکیولر فائنل اسکول میں شریک ہو گئے۔ پھر کچھ حالات ایسے ہوئے کہ ڈاکٹر سندیلوی صاحب کے لفظوں میں

> ”والد صاحب نے کسی بات پر ملازمت سے
> استعفا دے دیا جو میری تعلیم کے خاتمے کا

باعث ہوا ۔ بے کاری اور بے روز گاری کی
وجہ سے پانچ چھ سال انتہائی پریشانی میں گزرے "
(نیا دور جولائی ۹۳ء ص ۵)

مگر حصول علم کی خواہش بچپن سے ہی تھی ،گھر پر ہی تعلیم حاصل کرتے رہے ۔ اردو فارسی اور انگریزی کے بہت سے امتحانات پرائیوٹ ہی دئے اس میں ہندی مڈل (۱۹۳۲ء) سے لے کر ایم ۔اے اردو (۱۹۵۱ء) پھر پی ۔ایچ۔ ڈی (۱۹۶۰ء) تک ۲۸ سال کا زمانہ پوری جدو جہد اور شخصیت سازی کا ہے ۔ انہوں نے ایم اے کا امتحان آگرہ یونیورسٹی سے فرسٹ پوزیشن میں پاس کیا اور "حالی بہ حیثیت شاعر "کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ پروفیسر احتشام حسین صاحب کی نگرانی میں لکھا۔

ان کی ملازمت کا آغاز معلمی سے ہوا ۔ پہلے ایک دو اسکولوں میں مختصر مدت تک مدرس رہے جہاں بھی رہے وہاں اپنی صلاحیت اور محنت کا گہرا نقش چھوڑا۔جولائی ۱۹۳۸ء میں علی گنج کے اسکول میں تقرر ہو گیا۔ ابھی یہاں جمنے بھی نہیں پائے تھے کہ جیل میں قیدیوں کو پڑھانے کے لئے ان کا نام تجویز ہو گیا اور یکم جولائی ۱۹۳۸ء سے یہ سنٹرل جیل میں قیدیوں کی تعلیم کے نگراں مقرر کر دئے گئے۔ یہاں دو ہزار قیدی تھے جن میں تقریباً پندرہ سولہ سو قطعی ناخواندہ تھے۔ایک سے ایک بڑا اور خطرناک مجرم یہاں اپنے اعمال کی پاداش بھگت رہا تھا۔ ان قیدیوں میں سے ہی ۳۰۔۳۵ خواندہ قیدیوں کو انتخاب کر کے پڑھانے کا کام سونپا گیا ڈاکٹر سندیلوی صاحب (جو اس وقت تک ڈاکٹر تو کیا گریجویٹ بھی نہیں ہوئے تھے)

اس پورے تعلیمی منصوبے کے نگراں تھے۔ انھوں نے نہایت محنت اور سلیقے سے اس منصوبے کو چلایا۔ محکمہ کے افسر تو سندیلوی صاحب کے کام سے خوش تھے ہی، قیدی طالب علم بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے اور انہیں چاہتے تھے۔

اسی زمانے میں ہندوستان کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے بھی جیلوں میں آتے تھے ان میں بہت سی ممتاز شخصیات سے سندیلوی صاحب کا تعارف ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسی زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی
(غالباً علاج کے لئے) سنٹرل جیل بھیج دیا گیا
ان کے اور رفیع احمد قدوائی کے آنے سے
قیدیوں میں بڑا جوش پیدا ہو گیا تھا۔
رفیع احمد صاحب تو دوسرے تیسرے دن ہی یہاں
سے چلے گئے، نہرو جی رہے۔ سجاد ظہیر کے
کمرے کے برابر ان کا کمرہ تھا۔ یہ دونوں
اسپیشل کلاس میں (جس کو قیدی گورا بیرک
کہتے تھے کیونکہ پہلے وہاں صرف گورے ہی
لوگ نظر بند کیے جاتے تھے) رکھے گئے۔
نہرو جی جب تک رہے قریب قریب روزانہ
مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔
وہ لائبریری سے کتابیں منگواتے تھے۔ میری
ڈیوٹی تھی کہ اگر کتاب نہ ہو تو بازار سے خرید

لوں ۔نہرو جی نے ایک معیاری اردو لغت کی فرمائش کی لیکن ان کی فرمائش اس لئے پوری نہ ہو سکی کہ لغت کے جتنے نئے نام کتب خانوں سے معلوم ہوئے وہ صرف تین چار تھے ۔ نہرو جی ان سے واقف تھے ۔ نہرو جی نے قیدیوں کی تعلیم سے دلچسپی لی۔ جو قیدی اسپیشل وارڈ میں کام کرنے جاتے، نہرو جی کبھی کبھی ان کا سبق سن لیتے تھے ۔ یہ پندرہ بیس دن قیدیوں کے لئے عید کے دن جیسے تھے جو ملک جھکتے ختم ہو گئے"

جیل کی اس ملازمت کے دوران سندیلوی صاحب نے تین امتحانات پاس کئے کامل (فارسی) ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ (انگریزی)۔

اسی زمانے میں وہ بچوں کے لئے نظمیں بھی لکھتے تھے بعض چیزیں قیدیوں کے لئے بھی لکھیں اس ملازمت سے انہوں نے خانگی حالات سے مجبور ہو کر استعفا دے دیا اور کاکوری کے ایک اسکول میں انگلش ٹیچر ہو گئے ۔ انجمن اصلاح المسلمین نے لکھنؤ میں ایک اسکول یتیم بچوں کو مفت تعلیم دینے کے لئے کھولنے کا ارادہ کیا اور اس کی بھاگ دوڑ کے لئے شجاعت علی صاحب کا نام تجویز ہوا ۔یہ تو ایسے رفاہی اوراصلاحی کاموں میں جی جان سے لگ جانے والے تھے انہوں نے ہامی بھر لی اور ممتاز اسکول کی بنیاد رکھ دی گئی جو شجاعت صاحب اور ان کے رفقاء کی جان توڑ کوشش سے ۱۹۴۹ء میں

ہائی اسکول ہو گیا اس میں وہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۱ء تک ۲۰/۲۱۔ سال خود بھی پڑھاتے رہے اسی زمانے میں آگرہ یونیورسٹی سے بی ۔اے پھر ایم۔اے بھی پاس کر لیا۔

اگست ۱۹۶۱ء میں ان کا تقرر فیض عام ڈگری کالج شاہ جہاں پور میں بہ حیثیت لکچرر ہو گیا اور انہوں نے Join بھی کر لیا تھا مگر یہاں لکھنؤ یونیورسٹی سے پروفیسر احتشام حسین الہ آباد چلے گئے تھے اور ان کی جگہ خالی ہوئی تھی ،پروفیسر نورالحسن ہاشمی صدر شعبہ تھے ان کی جوہر شناس نظر نے شجاعت علی صاحب کا انتخاب کیا اور وہ ۱۶/ نومبر ۱۹۶۱ء سے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں استاد ہو کر آگئے ۔

حزیں از پائے رہ پیماد بسے سرگشتگی دیدم

سرشوریدہ بر بالیں آسایش رسید ایں جا

اب تک شجاعت علی صاحب کی جو کچھ خدمات تھیں وہ خاموشی سے گوشہ گمنامی میں انجام دی جا رہی تھیں قید خانے میں اندر کیا ہو رہا ہے کون کس کو کیا پڑھا رہا ہے اس کا باہر کی دنیا کو علم کہاں ہوتا ہے اسی طرح کسی اسکول کو قائم کرنے اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں اس کا بھی دور سے تماشا کرنے والوں کو اندازہ نہیں ہو سکتا یہ سب بھی فروغ علم کے لئے ہی تھا ،مگر جامعاتی سطح پر جو تدریس ہوتی ہے اور ریسرچ کرنے والوں کی رہنمائی کی جاتی ہے وہ صرف تعلیم ہی نہیں ہوتی بلکہ موجودہ ذخیرۂ معلومات میں اضافے کا سبب بنتی ہے اور اس تعلیم اور نگرانی کے ثمرات ان باصلاحیت طالب علموں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جنہیں

تعلیم و تدریس کا آگے چل کر بار اٹھانا ہوتا ہے۔

لکھنؤ یونیورسٹی سے وابستہ ہونے کے بعد ڈاکٹر شجاعت علی کے علمی فیوض کا دائرہ وسیع ہو کر عام ہو گیا اگرچہ وہ ۳۱ر اگست ۱۹۷۶ء کو ریٹائر ہو گئے مگر طلبہ سے ان کا رابطہ آخر عمر تک برقرار رہا وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علموں ہی کی نہیں بلکہ کانپور اور بریلی کی یونیورسٹیوں سے پی۔ایچ۔ڈی کرنے والے طالب علموں کی بھی برابر رہنمائی کرتے رہے۔

پندرہ سال یونیورسٹی کی باضابطہ سروس کے دوران انہوں نے ۸۔۹ طالب علموں کو ڈاکٹریٹ کرائی دو طالب علموں نے ان کی نگرانی میں کام کر کے روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔

وہ بہت سی علمی، تعلیمی اور ادبی انجمنوں میں بھی فعال رکن یا عہدیدار کی حیثیت سے رہے۔ ان میں ا۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی

۲۔ ممتاز انٹر کالج

۳۔ انجمن اصلاح المسلمین و ممتاز دارالیتامی

وغیرہ کا ذکر کیا جا رہا ہے باقی تفصیلات عارفین بانوی کی کتاب اور خود سندیلوی صاحب کی نوشتہ روداد حیات میں موجود ہے۔

انہیں ادبی و تعلیمی خدمات کے لئے متعدد انعامات بھی ملے۔ ان میں یو۔پی اردو اکاڈمی کا سب سے بڑا اعزاز برائے مجموعی خدمات شامل ہے (۱۹۸۶ء)

مراد آباد کمشنری کی اردو تنظیموں نے انہیں "محسن اردو" کا خطاب دیا تھا (۱۹۸۱ء)

اتر پردیش اردو اکاڈمی اور مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے ان کی کتاب "عطر آگہی" پر بھی انعام دیا تھا۔

ڈاکٹر سندیلوی صاحب نے مئی ۱۹۸۷ء میں امریکہ جا کر وہاں امیر خسرو سوسائٹی کے ایک جلسے میں بھی شرکت کی وہاں ان کی کتاب "امیر خسرو کی ہندی کویتا" کی رسم اجرا انجام دی گئی اور انہیں سند توصیف و اعتراف پیش کی گئی۔ان کی یہ کتاب امیر خسرو سوسائٹی آف امریکہ نے ہی شائع کی تھی۔

اردو زبان و ادب کا یہ عاشق صادق ،اردو کی بقا اور فروغ کے لئے ان تھک جدوجہد کرنے والا یہ مجاہد ، مولانا الطاف حسین حالی کی سیرت اور شخصیت سے کسب فیض کرنے والا یہ بیکس نواز ، انسان اور انسانیت سے محبت کرنے والا پیکر اخلاق و شرافت ، طالب علموں کا ہمدرد اور رہنما ۲۲ دسمبر ۱۹۹۶ء کو اس دنیا سے اس طرح رخصت ہوا کہ اس کے عزیزوں کے علاوہ سیکڑوں شاگردوں اور مداحوں کے دلوں میں اس کے نام کی جوت آج بھی جل رہی ہے۔

(۲)

تصانیف :

ڈاکٹر سندیلوی صاحب کے ثمرات قلم میں سے جو کچھ ہمیں ملا ہے اس کی نوعیت یہ ہے۔

(الف)۔ان کی تصانیف : ان میں مضامین کے چار مجموعوں کے علاوہ تالیفات بھی شامل ہیں۔بعض کتابیں قیدی طالب علموں کے لئے لکھی گئیں۔

کچھ وہ تالیفات ہیں جو بچوں کے لئے لکھیں اور کچھ مستقل موضوعات پر ہیں ان کی مجموعی تعداد (۳۹) ہوتی ہے۔ان میں (۶) کتابیں ہندی رسم الخط میں ہیں۔ چار مجموعوں میں کل (۱۷) مضامین شامل ہیں جو کلاسیکی ادب سے لے کر جدید ادب تک پھیلے ہوئے ہیں۔

(ب) جو مضامین مجموعوں میں شامل ہیں، یا ابتدائے عمر کی کاوشیں ہیں یا جو کچھ ریڈیو کے لئے لکھے گئے تھے، یا جو بعض اخباروں میں شائع ہوئے اور اب عام طور سے دستیاب نہیں، ان کی تعداد بھی کسی طرح (۵۰۔۶۰) سے کم نہ ہوگی۔

الف: ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی ادبی اور تدریسی تصانیف

نمبر شمار	نام کتاب	سال طباعت
۱	کلید سائیکالوجی	۱۹۳۷ء
۲	ہندستانی گیت (اردو میں)	۱۹۳۹ء
۳	ہندستانی گیت (ہندی میں)	۱۹۳۹۔۴۰ء
۴	آسان کتاب حصہ دوم	۱۹۵۴ء
۵	اردو ریڈر حصہ دوم	۱۹۵۴ء
۶	تعارف نظم اردو	۱۹۵۴ء
۷	تعارف نثر اردو	۱۹۵۴ء
۸	راکھی (ڈراما) موضوع: ہندو مسلم اتحاد	۱۹۵۵ء

Prof. Shi... RUDAULVI COLLECTION

۹	مطالعہء انیس	۱۹۵۶ء ☆☆☆
۱۰	مطالعہء حالی	۱۹۵۶ء ☆☆☆
۱۱	مطالعہء شبلی	۱۹۵۶ء ☆☆☆
۱۲	جواہراتِ اسمٰعیل	۱۹۵۸ء
۱۳	گلدستہء نثر	۱۹۵۸ء
۱۴	گلدستہء نظم	۱۹۵۸ء
۱۵	میٹھے بول (نظیر اکبر آبادی کی منظومات)	۱۹۵۸ء
۱۶	حالی کی مناجات بیوہ (ہندی) (ودھوا کی پرارتھنا۔ ناشر۔ لالہ رام دیال اگروال۔ الہ آباد)	۱۹۶۰ء
۱۷	تعارف تاریخِ اردو	۱۹۶۰ء
۱۸	حالی کی مناجات بیوہ (اردو)	۱۹۶۰ء
۱۹	حالی بہ حیثیت شاعر	۱۹۶۰ء
۲۰	مثنویاتِ حالی	۱۹۶۰ء
۲۱	تعارف تاریخِ اردو	۱۹۶۲ء
۲۲	آسان اردو (شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی)	چار ایڈیشن ☆ (۱) ۱۹۶۷ء۔ (۲) ۱۹۸۹ء
۲۳	ادبی تاثرات	۱۹۶۸ء
۲۴	آسان قواعد (جدید ایڈیشن)	۱۹۷۶ء

☆☆☆ یہ کتابیں ناظر کاکوروی کے اشتراک سے لکھی گئیں۔

☆ یہ کتابیں پروفیسر نور الحسن ہاشمی کے اشتراک سے لکھی گئیں۔

۲۵	باغ و بہار مع مقدمہ (مرتبہ)	۱۹۸۱ء
۲۶	عطر آگہی (مجموعہ مضامین)	۱۹۸۲ء
۲۷	حرف ادب	۱۹۸۵ء (پہلا ایڈیشن ۱۹۷۸ء)
۲۸	امیر خسرو اور ان کی کویتا (ہندی میں) (ناشر: امیر خسرو سوسائٹی آف امریکہ۔ شکاگو)	۱۹۸۶ء
۲۹	منتخباتِ جامعہ اردو (نظم و نثر)	۱۹۸۶ء
۳۰	فہم و بصیرت (تنقیدی مضامین)	۱۹۸۷ء
۳۱	امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری (اردو میں)	۱۹۸۹ء
۳۲	تعارف مرتبہ	
۳۳	اردو غزل کا پرتیچے (ہندی)	
۳۴	سوتنتر تا سنگرام کے سینانی (ہندی)	
۳۵	اردو لپی (رسم الخط کے بارے میں)	شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی
۳۶	گیتوں کی ڈالی	
۳۷	سمراٹ اور سینانی	
۳۸	انتخاب خطبات جمیعۃ العلماء ہند	(شائع کردہ اردو اکاڈمی لکھنؤ)
۳۹	انتخاب غزلیات حالی	(شائع کردہ اردو اکاڈمی لکھنؤ)

ب :ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کے وہ مضامین جو ان کے چار مطبوعہ مجموعوں میں شامل ہیں

پہلا مجموعہ : ادبی تاثرات۔ مطبوعہ ۱۹۶۵ء

۱۔ ظفر کی شاعری میں وطنیت

۲۔ حالی کی سیاسی شاعری

۳۔ سلیم کی شاعری میں وطنیت

۴۔ مجاز انقلاب بداماں شاعر

۵۔ جگر :ترجمان عہد

۶۔ فیض ترجمان حریت وانقلاب

(ت) فن اور فنکار

۷۔ سید انشاء

۸۔ اردو ادب میں غالب کا مقام

۹۔ آزاد : بہ حیثیت نظم نگار

۱۰۔ نذیر احمد :بہ حیثیت نظم نگار

۱۱۔ حالی کی شاعری

۱۲۔ مقدمہ شعر و شاعری

۱۳۔ انشائے شبلی

۱۴۔ اکبر الہ آبادی

۱۵۔ اسمٰعیل میرٹھی

۱۶۔ برج نرائن چکبست

(ج) چند مباحث

۱۷۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کا پس منظر

۱۸۔ غالب اور ذوق کا ادبی معرکہ

۱۹۔ حالی اور اودھ پنچ

۲۰۔ بیسویں صدی کے اردو ادب پر طائرانہ نظر

دوسرا مجموعہ : حرف ادب۔ مطبوعہ ۱۹۷۸ء

۲۱۔ امیر خسرو اور حب وطن

۲۲۔ زبان میر

۲۳۔ نظیر اکبر آبادی

۲۴۔ عالم ارواح کا گنہگار، غالب

۲۵۔ تاجدار مرثیہ، انیسؔ

۲۶۔ بچوں کا ادب اور حالیؔ

۲۷۔ شبلی بہ حیثیت انشا پرواز

۲۸۔ محسن کاکوروی : منفرد نعت گو

۲۹۔ عبدالماجد دریا بادی : اکبر کی نظر میں

۳۰۔ رئیس المتغزلین حسرت موہانی

۳۱۔ نقد معنی کا گنجدان احتشام حسین

۳۲۔ نغمہ سرائے حریت فیض احمد فیض

۳۳۔ مزاحیہ ادب میں اصلاحی پہلو

۳۴۔ خطبات عبدالحق پر ایک نظر

تیسرا مجموعہ : عطر آگہی مطبوعہ ۱۹۸۶ء

۳۵۔ خسرو شیریں زبان

۳۶۔ فارسی میں اخلاقی شاعری

۳۷۔ انیسویں صدی میں اردو کے دبستاں

۳۸۔ فورٹ ولیم کالج کی اردو خدمات

۳۹۔ میر امن : آسان نثر اور اسلوب کا بانی

۴۰۔ باغ و بہار پر ایک نظر

۴۱۔ خواجہ میر درد

۴۲۔ میر تقی میر

۴۳۔ اردو شاعری میں حزنیہ عنصر

۴۴۔ غالب اور احساسِ غم

۴۵۔ مرزا غالب : منفرد نثر نگار

۴۶۔ حالی اور غالب

۴۷۔ حالی : طبقۂ نسواں کا سچا حامی

۴۸۔ حالی اور قومی یک جہتی

۴۹۔ حالی پر چک بست کا مضمون

۵۰۔ مولانا محمد علی جوہر : بہ حیثیت نثر نگار

۵۱۔ اقبال بہ حیثیت مفکر

۵۲۔ فانی بدایونی

۵۳۔ حسرت موہانی

۵۴۔ اثر لکھنوی کے نظریات اور وطنی رجحانات

۵۵۔ مولانا عبدالماجد دریابادی : خطوط کے آئینے میں

چوتھا مجموعہ : فہم وبصیرت مطبوعہ ۱۹۸۷ء

۵۶۔ بہادر شاہ ظفر : قومی یک جہتی اور حب الوطنی کا سرچشمہ

۵۷۔ سرسید احمد خاں کے قومی و وطنی رجحانات

۵۸۔ چکبست کا تصورِ وطنیت

۵۹۔ مجاز : شاعر حریت وانقلاب

۶۰۔ مثنویات حالی کا تعارف و تجزیہ

۶۱۔ حالی اور غزل

۶۲۔ حالی بہ حیثیت سوانح نگار

۶۳۔ اردو تنقید کے ارتقاء میں احتشام حسین کا حصہ

۶۴۔ فسانۂ آزاد : تعارف اور تجزیہ

۶۵۔ علی عباس حسینی کا نظریۂ فن

۶۶۔ شوکت تھانوی کی خاکہ نگاری

۶۷۔ فرقت کاکوروی : پیکر طنز و ظرافت

۶۸۔ چکبست و شرر کا ادبی معرکہ

۶۹۔ نشور واحدی بہ حیثیت نثر نگار

۷۰۔ عبدالرحیم خانخاناں : ہندی کا صاحب طرز شاعر

۷۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ادبی معرکے

حالی بہ حیثیت شاعر :

یہ کتاب بڑے سائز کے ۳۹۲ صفحات پر محیط ہے۔
اس میں مقدمہ، حرف آخر اور کتابیات کے سوا چھ ابواب ہیں۔

باب اول حالات حالؔی

باب دوم : عہد حالی اور اس کا پس منظر

باب سوم : حالی کا نظریۂ شعر و شاعری

باب چہارم : حالی کی شاعری

باب پنجم : حالی کی مخالفت

باب ششم : حالؔی بہ حیثیت شاعر

اس کا پہلا ایڈیشن ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے دسمبر ۱۹۶۰ء میں شائع کیا تھا اس کی تالیف میں سندیلوی صاحب نے (۱۱۵) کتابوں سے استفادہ کیا تھا جن کی فہرست کتابیات کے عنوان سے آخر میں دی گئی ہے۔ ان (۱۱۵) ماخذوں کے سوا بھی بہت سے اخبار و رسائل ایسے ہیں جن کا اندراج کتابیات میں نہیں ہو سکا ہے۔

مولانا حالؔی سے ڈاکٹر سندیلوی کو مزاج اور مذاق کی موافقت حاصل تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ مقالہ صرف پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے لئے نہیں بلکہ اس کی تحریر میں ان کا دل اور دماغ دونوں شریک رہے ہیں۔ اس کا اسلوب نثر بھی وہ ہے جس کی سادگی اور اثر انگیزی کو حالؔی سے منسوب کیا جاتا ہے جو خود حالؔی کی تصانیف نثر میں نظر آتا ہے اور جس کا کامیاب تتبع بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کیا ہے۔ اسلوب کی نہایت جامع تعریف تین لفظوں میں کی گئی ہے۔

Clarity یعنی وضاحت جسے ہم سلاست بھی کہتے ہیں

Brevity یعنی ایجاز جس میں الفاظ کا اسراف نہ ہو

Urbanity شائستگی جس میں موضوع کے لحاظ سے الفاظ اور لب و لہجہ کا استعمال ہو، کچھورپن نہ ہو۔

عام طور سے مشاہدہ یہ ہے کہ پی ایچ ڈی کے مقالات میں کچھ نہ کچھ خامیاں ضرور رہ جاتی ہیں اس لئے کہ

(i) یا تو مقالہ نگار کی رسائی تمام مآخذ اور Related Material تک نہیں ہوتی جو کچھ مل جاتا ہے وہ اسی پر قناعت کر کے اپنا مقالہ لکھ دیتا ہے۔ کیوں کہ مقصود تو ڈگری لینا ہوتا ہے وہ یہ سوچ کر اپنے ذہن کو مطمئن کر لیتا ہے کہ اصلاح و اضافہ بعد میں کر لیا جائے گا۔

(ii) یا اسے اپنے انتخاب کردہ موضوع سے ذہنی مطابقت نہیں ہوتی، اس لئے بعض نکتوں کو نہیں سمجھ پاتا یا ان کی غلط تاویل کرتا ہے۔

(iii) یا مقالہ نگار میں قوت بیان و اظہار نہیں ہوتی جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ ادبی چٹخارے اسلوب میں کہتا ہے جس سے پڑھنے والا متاثر نہیں ہوتا۔ موضوع کے اعتبار سے اسلوب کا نہ ہونا بھی بعض خامیوں کا سبب بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر سندیلوی کا یہ مقالہ ہر اعتبار سے مکمل ہے اور اسے پی۔ ایچ۔ ڈی کے اردو مقالات کے لئے مثالی نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی چند نمایاں خوبیاں یہ ہیں۔

(1) مولانا حالی کی شاعری پر اردو میں اس سے بہتر دوسری کوئی کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی۔

(۲) اس میں حالی سے متعلق تقریباً سارے مآخذ اور Related material سے براہ راست استفادہ کیا گیا ہے حتی الامکان کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔

(۳) اس میں اعتدال و توازن ہے یہ خوبی عموماً کمیاب ہوا کرتی ہے۔ ڈاکٹر سندیلوی نہ Hero worship کی حد تک جاتے ہیں، نہ صرف عیوب کی تلاش کرتے ہیں۔ انہوں نے حالی اور ان کی شاعری کو صحیح سیاق و سباق میں پیش کیا ہے جہاں نقد و جرح کی ضرورت تھی اس سے دامن نہیں بچایا اور جہاں محاسن کے اعتراف کا موقع تھا اس کا بھی حق ادا کیا ہے۔

(۴) اس مقالہ کا اسلوب نہایت پاکیزہ، شیریں، دلچسپ اور ادبی چاشنی لئے ہوئے ہے۔ وہ آسان اور بے تکلف انداز میں لکھتے ہیں بھاری بھر کم اصطلاحیں اور ثقیل الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ موقع کی مناسبت سے نہایت برمحل اشعار بھی نثر میں ٹانک دیتے ہیں جس سے عبارت کا حسن اور تاثیر دونوں بڑھ جاتے ہیں۔ یہ اسلوب قاری کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے کہیں بھی بے لطف نہیں ہوتا۔

جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس وقت کی نہایت قدآور ادبی شخصیات نے اس کا کس طرح استقبال کیا تھا اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ تین مختصر اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا تھا:

مولانا حالی کی شاعری کا اس سے بہتر مطالعہ
کسی اور کتاب میں نہیں ملتا۔ اس لئے یہ کتاب
میرے نزدیک اردو کے تنقیدی سرمائے میں

ایک اہم اضافہ ہے۔"

علامہ نیاز فتح پوری نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"ڈگری حاصل کرنے کے لئے جو مقالے لکھے جاتے ہیں ان میں عموماً دو قوتیں کام کرتی ہیں، ایک قوت حیوانی جس کا تعلق ماخذوں کی ورق گردانی سے ہے۔ دوسری قوت ذہنی و فکری ہے جس کا تعلق محاکمہ، اخذ نتائج سے ہے لیکن ایک تیسری قوت اور بھی ہے جو اس تمام استقرا و استنباط کو ایسے اسلوب سے پیش کرتی ہے کہ مقالہ خود اپنی جگہ پارۂ ادب ہو جاتا ہے اور اس قوت کا نام قوت عبقریت ہے پھول چن چن کر دامن بھر لینا آسان ہے لیکن اس کو خاص سلیقہ و حسن کے ساتھ گلدستہ کی صورت دینا بڑا ذوق سلیم چاہتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے فاضل دوست شجاعت علی سندیلوی نے جو مقالہ حالی کی شاعری پر لکھا ہے وہ ان تینوں خصوصیات کے لحاظ سے بڑا کامیاب مقالہ ہے۔"

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب جیسے ناقد و محقق نے ان لفظوں میں داد دی :

"جیسا جیسا میں اس مقالہ کو پڑھتا گیا اتنا اتنا ہی اس کے لکھنے والے کی تجسس و تحقیق و عرق ریزی اوراخذ و استنباط کی صلاحیت کا قائل ہوتا گیا جو بحث اٹھائی ہے اس کا کوئی پہلو تا حدِ امکان نظر انداز نہیں کیا ہے۔

شجاعت علی صاحب کا یہ کارنامہ" ایسا ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں اپنے موضوع پر یہ سب سے زیادہ جامع کتاب ہے جس کے لئے فاضل مصنف شکریہ کے بھی مستحق ہیں اور مبارک باد کے بھی۔

اس کتاب میں جتنے بھی مباحث آئے ہیں ان میں ڈاکٹر سندیلوی صاحب نے تحقیق و تنقید اور نتائج کے صحیح استخراج اور محاکمے کا حق ادا کیا ہے اس کا دوسرا باب "عہد حالی اور اس کا پس منظر" ان کے مطالعہ کی وسعت اور فکر کے توازن کا شاہد ہے، جو خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا حالی کے بارے میں ان سے خاندانی نسبت رکھنے والوں نے بھی لکھا ہے اور ظاہر ہے کہ اسے اس نسبتِ تعلق کے باعث زیادہ مستند سمجھا جا سکتا ہے، مگر بعض امور میں شجاعت علی صاحب نے ان کے اخذ کردہ نتائج سے بھی اختلاف کیا ہے اور زیادہ قوی شہادتوں کے ساتھ اپنا مقدمہ پیش کیا ہے۔

حالیؔ کے انتقال کے بعد ہی ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کے عصر جدید میں خواجہ غلام الثقلین نے ایک مضمون لکھا تھا اس میں انہوں نے مولانا حالیؔ

کی ابتدائی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

"غدر سے دو تین سال پہلے مولانا دہلی میں زیر تعلیم تھے۔اس زمانے میں ایک عربی رسالہ آپ نے تصنیف کیا جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خاں بہادر کی تائید میں تھا جسے ان کے استاد نے پڑھ کر نہایت ناراضگی کا اظہار کیا یہاں تک کہ اسے چاک کر دیا"

یہ واقعہ خواجہ غلام الثقلین ہی کے حوالے سے دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی نقل کیا ہے۔لیکن تحقیق و تائید کا محتاج ہے۔ ڈاکٹر سندیلوی نے اس ابتدائی تحریر کا ذکر کرنے سے پہلے لکھا ہے :

" حالی نے مذہبی ماحول میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔اس ماحول کا اثر ان پر تمام عمر قائم رہا۔ ابتدا میں مذہبی جوش زیادہ تھااور مذہبیت غالب تھی تاہم مذہبی تعصب اور تنگ نظری ان میں نام کو نہیں تھی اور وہ بے خوف ہو کر حق بات کی تائید کرتے تھے۔چنانچہ جب وہ مولوی حسین بخش کے مدرسے میں زیر تعلیم تھے ۔ نواب صدیق حسن خان(والیہ بھوپال کے شوہر) نے ایک مذہبی رسالہ لکھا۔ نواب

صاحب مذہباً اہلِ حدیث تھے اور ان کے بہت سے عقائد اہل سنت و الجماعت تسلیم نہیں کرتے تھے ۔ حالی اس رسالہ کی تائید میں ایک رسالہ عربی میں لکھ کر اصلاح کی غرض سے اپنے استاد مولوی نوازش علی کے پاس لے گئے مولوی صاحب حنفی المذہب تھے رسالہ دیکھ کر آگ بگولا ہو گئے اور اس کو فوراً چاک کر ڈالا “

(حالی بہ حیثیت شاعر ص ۲۲)

اس روایت میں کئی باتیں تنقیح طلب ہیں ۔

(الف) ۱۸۵۳ء تک حالی پانی پت میں تھے یہاں انہوں نے عربی صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں حاجی ابراہیم حسین انصاری سے پڑھی تھیں ۔ عربی زبان کی باضابطہ اتنی تحصیل اس وقت تک نہیں کی تھی کہ نواب صدیق حسن خاں جیسے کسی عالم کے رسالے کا جواب دے سکیں ۔

(ب) ۵۳-۱۸۵۴ء میں وہ دہلی آئے یہاں انہوں نے تقریباً ڈیڑھ برس میں مولانا فیض الحسن سہارن پوری ، میاں نذیر حسین محدث دہلوی اور مولوی امیر احمد وغیرہ سے عربی ادب اور حدیث کی تعلیم حاصل کی ۔

(ج) بعد کے زمانے میں بھی انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی فہرست مصنف صاحب نے اس کتاب میں دی ہے ، ان میں کوئی تصنیف یا تالیف عربی زبان میں نہیں ہے جو کچھ ہے وہ فارسی یا اردو میں ہے ۔

نواب صدیق حسن خان غدر یعنی ۱۸۵۷ء سے پہلے کوئی معروف شخصیت نہ تھے ان کا بھوپال جانا، والیہ بھوپال سے نکاح کرنا اور تصنیف و تالیف میں انہماک وغیرہ ۱۸۵۷ء سے کئی برسوں کے بعد کا واقعہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی غلط مشہور ہو گیا ہے کہ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کی جاگیر واگذار کرانے اور مولانا فضل حق خیر آبادی کو جزائر انڈمان کی قید سے رہا کرانے میں نواب صاحب کا کچھ حصہ رہا وہ اس وقت تک کوئی ممتاز اور معروف شخصیت نہیں تھے۔

نواب صاحب کی داستان حیات بھی مآثر صدیقی کے نام سے شائع ہو چکی ہے ان کی تصانیف اور تالیفات کی بھی تقریباً مکمل فہرست مل جاتی ہے اس میں یہ دیکھنا ممکن ہے کہ ان کی تصانیف کا آغاز کب سے ہوا؟ یا وہ کون سا رسالہ ہو سکتا ہے جس کی تائید مولانا حالی کے قلم سے کی جا سکتی ہو۔

خود مولانا حالی کو مذہبی مباحث یا منطق سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ان کی تصانیف کا مرکزی خیال اصلاح معاشرہ اور اصلاح اخلاق ہی رہا۔

اگر حالی کی اس ابتدائی قلمی کاوش کی روایت کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ رسالہ جس کی تائید میں انہوں نے کچھ لکھا، کسی اور کی تصنیف رہا ہوگا۔ اس زمانے میں حنفیوں کے ان دو گروہوں میں جنہیں مسائل پر بحث و مناظرہ ہوا کرتا تھا جنھیں آج ہم بریلوی اور دیوبندی کی اصطلاحوں سے یاد کرتے ہیں۔

اس طرح کے چند مقامات ہیں جن پر گفتگو کی گنجائش نکل سکتی ہے ورنہ ڈاکٹر سندیلوی صاحب کی یہ تصنیف ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر جتنا فخر کریں کم ہے اور اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اصلی ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی وہی تھے

جنہوں نے حالی بہ حیثیت شاعر لکھی ہے ،باقی ان کی تصانیف اگر اس پائے کی نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ صلاحیت کی کوئی کمی ہے بلکہ وہ سب تصانیف ان کے اصلی مقصد حیات سے وابستہ ہیں یعنی ان کا مطمح نظر تحقیق و تنقید سے مختلف ہے اگر غور کیا جائے تو اس سے اعلیٰ بھی ہے۔ یعنی

(۱) انہوں نے جرائم پیشہ قیدیوں کی تعلیم کے لئے لکھا تاکہ انہیں زمانہ اسیری میں کچھ لکھنا پڑھنا بھی آجائے اور جب وہ زنداں سے نکلیں تو کسی قدر مہذب ہو کر نکلیں شاید ان کی زندگی کا رخ بدل جائے۔

(۲) یا انہوں نے چھوٹے بچوں کے لئے ہلکی پھلکی نظمیں اور کہانیاں لکھیں اس کا مفہوم بھی یہ رہا کہ بچوں میں زبان کا صحیح مذاق پیدا ہو،وہ اچھی اردو سیکھیں، لکھیں، بولیں۔ان کو اردو ادب سے لگاؤ پیدا ہو اس کی لطافتوں کو سمجھ سکیں۔

ایک بہت عام غلط فہمی بلکہ غلط اندیشی یہ ہے کہ ادبی معیار بندی میں بچوں کے لئے لکھی جانے والی تحریروں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ انہیں ہلکی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔حالانکہ میں یہ کہتا ہوں اور اپنے تجربے کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ تحقیقی مقالہ یا تنقیدی مضمون لکھنا بہت آسان ہے بچوں کے لئے لکھنا اس کے مقابلے میں سخت دشوار ہے مگر نہایت بنیادی اہمیت کا کام ہے ہم کوئی تحقیقی مقالہ یا کتاب لکھتے ہیں تو اہل نظر اسے پڑھتے ہیں ،ان سے داد بھی مل جاتی ہے اور ہمارے نفس کی تسکین ہو جاتی ہے۔ بچوں کے لئے کچھ لکھتے ہیں تو اسے پڑھنے والے اس سے محظوظ ہوتے ہیں بلکہ ان کے ذہن میں ہماری تحریر ایسی چھپ جاتی ہے کہ اسے زندگی بھر نہیں بھولتے مگر وہ بچے ہمیں Feed-back نہیں دیتے اور داد پانے کی ہوس تشنہ رہ جاتی ہے۔

جسے اپنی زبان اور اپنی ثقافت سے محبت ہو گی اور ان کا رواج چاہتا ہو گا وہی بچوں کے لئے لکھنے کی فکر کرتا ہے اور صلہ و ستائیش سے بے نیاز رہ کر لکھتا ہے۔

(۳) ڈاکٹر سندیلوی صاحب کے تیسرے مخاطب بھی وہی لوگ ہیں جنہیں "بے ضابطہ طالب علم" کہا جاسکتا ہے۔بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کسی مجبوری سے اسکول یا کالج میں نہیں پڑھے مگر انہیں مطالعے کا شوق ہوتا ہے۔ یہ قاری کی وہ کلاس ہے جسے بچوں کے ادب سے اوپر اور گریجویٹ سطح سے نیچے متوسط درجے کا ادب درکار ہے ،ایسے بے ضابطہ طالب علم کے لئے ہماری بڑی محققانہ تحریریں دوکوڑی کی وقعت نہیں رکھتیں ۔مگر زبان و ادب کا تعارف کرانے والی ہلکی پھلکی کتابیں انہیں بہت نفع پہنچاتی ہیں ۔ اس رمز کو بھی ہر ایک نہیں سمجھتا کہ پڑھنے والوں کے مختلف طبقات ہوتے ہیں اعلیٰ ترین سے ادنیٰ ترین تک ۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کس کتاب کا قاری کس طبقے سے مل سکتا ہے۔

ڈاکٹر سندیلوی صاحب کی بعض تالیفات نے ایسے بے ضابطہ طالب علموں کے لئے مفید کتابیں لکھی ہیں اور وہ مقبول بھی ہوئی ہیں ۔اسی میں ضمناً کردار سازی کے ساتھ ذہن سازی یا تعمیر ذہنی کا کام بھی ہو جاتا ہے۔ خیال رہے کہ انہوں نے اپنے کئی مضامین میں حبِ وطن اور اتحاد قومی کو فروغ دینے والے عناصر کو نمایاں کیا ہے اور مختلف ادیبوں ،شاعروں کی تحریروں میں حب الوطنی کے جذبات و خیالات کا جائزہ لیا ہے۔

۴) ڈاکٹر سندیلوی صاحب کے مخاطبین اور جن کے لئے وہ لکھتے رہے ان کا ایک طبقہ یونیورسٹی اور کالج کے طالب علموں کا ہے ۔ان کے بیشتر

مضامین اور کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد میرا تاثر یہی ہے کہ یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے (بلکہ آج کل تو بعض اساتذہ کے لئے بھی) ڈاکٹر سندیلوی صاحب کے مضامین بہت مفید ہیں۔ وہ فضول مباحث میں نہیں الجھتے صرف کام کی باتیں صاف سیدھے اسلوب میں بیاں کرتے ہیں اس سے ان کے مفہوم اور مافی الضمیر کو سمجھنا کسی کے لئے بھی دشوار نہیں رہتا۔

ہونا تو یہ چاہئے کہ ان کی تمام تصانیف کا فردا فردا جائزہ لیا جائے مگر ایک لکچر میں تو یہ ممکن نہیں۔ ایک کیا دو چار لکچر میں بھی پورا جائزہ نہیں سما سکتا۔ یہ تو ایک پوری کتاب کا متقاضی ہے۔ عارفین بانو نے ایم۔اے کا Dissertation لکھ کر اس کی ابتدا کی ہے اب کسی باصلاحیت طالب علم کو .Phd کے لئے ڈاکٹر سندیلوی کی ادبی خدمات کا موضوع لینا چاہئے۔ ابھی تو بہت کچھ Source material مل جائے گا۔

(۳)

اس حصے کو تشنہ چھوڑ کر اب میں لکچر کے تیسرے اور آخری نقطے پر اختصار سے ہی گفتگو کروں گا اور وہ ہے "اردو زبان کے لئے ان کی عملی خدمات"۔

اس مجمع میں کئی حضرات ایسے ہوں گے جو شخصی طور پر ڈاکٹر شجاعت علی صاحب سے واقف رہے ہوں گے۔ ممکن ہے بعض ان کے شاگرد بھی رہے ہوں، یا کچھ حضرات کو ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہو۔ وہ میرے اس قول کی تصدیق کریں گے اور میرے احساس میں شرکت کریں گے کہ انہوں نے اپنے لئے جو راستہ چنا تھا وہ اس راستے پر ثابت قدمی سے گامزن رہے

اور اپنے منصبی فرائض کو بھی ایک عبادت کی طرح انجام دیتے رہے ۔ انھیں نام و نمود، اعزازو اکرام اور صلہ و ستائش کی تمنا بھی نہیں تھی ورنہ جوڑ توڑ کی راہ اختیار کرکے وہ اس سے بہت زیادہ دنیاوی منافع حاصل کر سکتے تھے ۔جو انہوں نے کئے جہاں ان کے سوانحی وقائع کا ذکر آتا ہے وہیں ان اعزازات کی فہرست بھی دی جاتی ہے جو ان کی خدمت میں پیش کئے گئے ۔ مگر میرا تاثر یہ ہے کہ وہ ہم سب کو مقروض چھوڑ گئے ۔ ان کی خدمات کا اعتراف اس سے بہت زیادہ ہونا چاہیئے تھا جتنا ہوا۔

یہ ان کی تربیت اور اپنے نصب العین سے وفاداری ہی کا اثر تھا کہ ان کے صاحبزادے ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کو جو اعلیٰ درجے کی تعلیمی صلاحیت اور علمی مذاق رکھتے تھے جب سنبھل کے ایک کالج میں لیکچرر کی جگہ ملی توانہوں نے اسے خوش دلی سے قبول کیا، سنبھل ایک قصبہ ہے ، اس کا ماضی کبھی بہت ہی شاندار تھا لیکن اب وہاں شعر و ادب وغیرہ کا کچھ زیادہ چرچا نہیں تھا۔سعادت مرحوم نے وہاں رہ کر اتنا کام کیا کہ مغربی یو۔پی کے نقشے میں اردو کے تعلق سے سنبھل کا نام بھی بار بار سامنے آنے لگا ۔ انہوں نے سنبھل کے علماء ،شعراء، اہل قلم اور آثار ماضیہ پر بھی کام کیا اور اس کے آس پاس جو چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں جن کی طرف کبھی کسی نے التفات نہیں کیا تھا ان کی بھی ثقافتی تاریخ کا اتنا Material جمع کر دیا کہ اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔اردو تحریک کے لئے پورے ضلع کو متحد اور بیدار کر دیا۔

سعادت صاحب اردو کی بھلائی کے لئے برابر مطالبے کرتے رہے اور اپنی کزور صحت کے باوجود تگ و دو میں بھی کوئی کمی نہیں کی جہاں رہتے تھے اس جگہ کا نام بھی اردو گھر مشہور ہو گیا انہوں نے اپنی ذاتی کوشش سے اردو کی Post Graduate کلاسیں سنبھل میں شروع کرادیں، یہ سب بھی بالواسطہ ڈاکٹر شجاعت علی صاحب کا کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔

خود ڈاکٹر سندیلوی نے برسوں تک قیدیوں کو تعلیم دی۔ جہاں کے احوال سے باہر کی دنیا کو کچھ خبر نہیں ہوتی نہ اس کی کوئی شہرت ہوئی ہے نہ صلہ و انعام ملتا ہے نہ نام و نمود میں اضافہ ہوتا ہے پھر انہوں نے مختلف مدرسوں میں چھوٹے بچوں کو بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھایا یہ بھی اردو کی عملی خدمت تھی۔

۱۹۴۷ء کی پہلے کی دنیا انہوں نے دیکھی تھی جب اردو کے ساتھ کوئی تعصب نہیں تھا وہ ہمارے ملک میں پڑھی اور پڑھائی جاتی تھی۔ مگر ہمارے وطن کے ایک شاعر شہباز امروہوی نے کہا تھا۔

ہوا جب آزاد ملک میرا تو میں نے چاہا کہ گاؤں نغمہ
مگر دہن کھول کر جو دیکھا تو منھ کے اندر زباں ندارد !

(اور قطع کلام کی معذرت کے ساتھ یہیں ایک غزل کا ایک اور شعر سنائے بغیر بھی نہیں رہا جاتا جو آج کے دور کی صحیح اور سچی تصویر ہے)

جمی تھی ایواں میں رات محفل، وزیر تھے جملہ اس میں شامل
ہوا نہ تھا پیش ابھی کوئی بل کہ شمع بگل پگڑیاں ندارد

خیر یہاں لکھنؤ میں جو اردو زبان کی دوسری بڑی ٹکسال اور اردو ادب کا دوسرا بڑا وبستاں سمجھا جاتا رہا ہے جس کے بغیر اردو ادب کی کوئی

تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی جہاں رتن ناتھ سرشار نے فسانہ آزاد لکھا تھا ، دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم رچی تھی، برج نرائن چکبست نے حب الوطنی کے گیت گائے تھے ۔جس سرزمین نے اردو زبان، اس کے محاورے و روز مرہ کو ایسا سجایا سنوارا تھا وہاں جب ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جی ہاں آزادی کے پہلے ہی دن جھنڈے والی پارک امین آباد لکھنؤ میں بھارت کا پھریرا لہرایا گیا تو اس کے نیچے جو اردو کی عبارت لکھی ہوئی تھی اسے پہلے مٹا دیا۔ اور یہ سب ڈاکٹر سندیلوی صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس کا گہرا اثر بلکہ صدمہ قبول کیا تھا اور اس کا وہ بار بار اپنی تحریروں میں حوالہ دیتے تھے ۔

اس کے بعد اردو کشی کا جو سلسلہ شروع ہوا، اسکولوں سے اردو غائب ہوتی رہی دفتروں سے، سائن بورڈوں سے ہر جگہ سے اسکا صفایا کیا گیا یہ بھی ڈاکٹر سندیلوی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا انہوں نے اردو کے لیے ہر تحریک میں عملی حصہ لیا اپنی صلاحیت اور اپنے اوقات کو مکمل طور پر اس کے لیے وقف کر دیا۔ وہ اردو کے لیے بیس لاکھ دستخطوں کی مہم میں بھی شریک تھے انجمن ترقی اردو کی صوبائی شاخ میں بھی سرگرم عمل رہے۔

انھیں محمد حسین شمس علوی صاحب سے تعاون ملا تو وہ ماہ نامہ فروغ اردو کے برسوں تک ایڈیٹر رہے ۔ اس کے کئی خاص نمبر بھی شائع کیے اس کا اداریہ "اپنی باتیں" کے عنوان سے وہ عموماً اردو کے مسائل پر ہی لکھا کرتے تھے انھوں نے کم و بیش ڈیڑھ سو اداریے لکھے ہوں گے جن سے (اب اگر ان کا سلسلہ وار مطالعہ کیا جائے تو) اردو کا پورا ہسٹری شیٹ بن سکتا ہے۔

جو گروہ اردو کا مخالف ہے اور اسے سر سبز ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا تو وہ تاریخی شعور سے سے بے بہرہ ہے اور معذرت کے ساتھ یہ کہوں گا کہ کسی طرح کی ذہنی پیچیدگی Complex کا شکار ہے اردو والوں نے کبھی ھندی بھاشا کو اپنا حریف نہیں سمجھا بلکہ مسلمانوں نے نہ صرف ہندی ساہتیہ کی بلکہ سنسکرت زبان کی بھی سرپرستی کی ہے پنڈت لکشمی دھر کی کتاب (Muslim patronage to sanskrit learning) پڑھ لیجیے آپ کو معلوم ہوگا کہ خود سنسکرت میں مسلمانوں کا کیسا لگاؤ رہا ہے اگر یہ عام نہ ہو سکا تو اسکا سبب یہی تھا کہ اس زبان کے پنڈت مسلمانوں کو سکھانا نہیں چاہتے تھے ھندی ساہیتہ کے اتہاس سے آپ اگر ملک محمد جائسی رحمن، رسکھان، رسلین، عثمان، قطبن، الکھ داس جیسے شاعروں کو نکال دیں تو کلاسکی ادب کی تاریخ میں کیا باقی بچتا ہے؟

اردو کا Contribution تو یہ ہے کہ اس دیس کا نام ھند اور ھندوستان بھی اردو ہے اس کی نسبت سے ھندی اور ھندو بھی۔ اردو زبان میں تمام افعال ھندی سے ہی آئے ہیں صرف اسماء صفات اور اصطلاحیں عربی یا فارسی سے لی گئی ہیں جیسے آج ہم انگریزی سے مستعار لیتے ہیں ٹیلی فون، ٹیلی ویژن، ٹیلی پرنٹر، ریلوے اسٹیشن، ٹکٹ انجن، ان میں سے کسی کے لیے ہمارے پاس اپنا گھڑا ہوا لفظ موجود نہیں۔

اردو نے عربی فارسی سے ہی نہیں ہندوستان کی دوسری سب زبانوں سے خوشہ چینی کی ہے اس میں دری تاجک، پنجابی، سندھی، گجراتی، بنگالی، مراٹھی ہر زبان کا لفظ ملے گا یہاں مثالیں دینے کا وقت نہیں۔ اس موضوع پر

علما ئے لسانیات بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ زبان نہ کوئی حکومت بناتی ہے نہ کوئی مذہب بناتا ہے نہ بنا سکتا ہے البتہ چوں کہ بیشتر مذاہب کے پاس اپنی مقدس کتابیں بھی ہوتی ہیں اور وہ کتابیں کسی نہ کسی زبان میں ہوں گی اس لیے اس زبان کو اس مذہب سے مخصوص سمجھ لیا جاتا ہے جیسے بدھ مت کی زبان پالی ہے ، ہندوسناتن دھرم کی سنسکرت ہے ، یہودیت کی عبرانی ہے۔مسلمانوں کی عربی ہے ۔ اس کو اس طرح اختصار کے لیے کہا جاتا ہے ورنہ عربی مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ مسلمانوں کی مقدس کتاب اور دینِ اسلام کے بنیادی ستون عربی زبان میں ہیں۔
اسلام سے پہلے یہی عربی غیر مسلموں کی زبان تھی اور آج بھی ہے ۔

اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا غلط ہے ، مگر میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ہے تو اسے اقلیت کی زبان کے حقوق ملنا چاہئیں لیکن ہو یہ رہا ہے کہ اردو کے نام سے جتنے نقصان ہیں وہ سب مسلمانوں کی قسمت میں لکھ دیئے گئے ہیں اور اسی زبان کے وسیلے سے اگر کسی طرح کا فائدہ وابستہ ہو جاتا ہے تو یہ فورا سیکولر زبان بن جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے سیکولر ہونے کا مطلب کیا ہے۔

ہمارے لئے اطمینان اور تسلی کی بات یہ ہے کہ ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے یہاں کسی بھی مطالبے کے لیے جدوجہد جاری رکھی جاسکتی ہے، اردو جو اتنے طویل عرصے تک مظالم کا شکار رہی ہے کبھی نہ کبھی اس کے دن بھی ضرور پھریں گے، اس وقت کسی کو شائد یہ دھیان بھی نہ آئے کہ ماضی کی ان تاریک راہوں میں چراغ روشن کرنے والا ایک استاد بھی تھا جس کا نام شجاعت علی سندیلوی تھا۔

عکسِ تحریر

از غمزدہ سعادت

اے سعادت، اے مرے لختِ جگر ۔ جا بسے فردوس میں تجھ کو چھوڑ کر
عشرۂ رحمت میں رخصت ہو گئے ۔ ہے دعا اللہ! تم کو بخشے
اس صنعیفی میں ہوا مجھ کو یہ غم ۔ اضطرابِ دل نہیں ہوتا ہے کم
ہر گھڑی تم یاد آتے ہو مجھے ۔ خون کے آنسو رُلاتے ہو مجھے
قلبِ مضطر کو نہیں آتا قرار ۔ چشم رہتی ہے ہمیشہ اشکبار
اے خدا! صدقہ رسولِ پاک کا ۔ صبر کی طاقت مجھے کر دے عطا

یہ شجاعت علی سندیلوی مرحوم کے لائق فرزند نامور ادیب اور محقق ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کا انتقال ۱۳، فروری ۱۹۹۴ء کو ہوا تھا۔ جواں مرگ بیٹے کی جدائی کا صدمہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اُس وقت ان کی عمر ۷۶ سال سے متجاوز تھی۔ جسمانی کمزوری اور ضعفِ بصارت کی وجہ سے باہر کم ہی نکلتے تھے۔ اس صدمے نے انھیں بالکل گوشہ نشیں کر دیا۔ لکھنا پڑھنا بھی دشوار ہو گیا۔ ایسی تحریر جو جلی حروف میں ہو، وہی پڑھ سکتے تھے اور کچھ لکھنا ہوتا تو جلی حروف میں ہی لکھتے تھے۔ درد و غم میں ڈوبے ہوئے یہ اشعار مرحوم نے انھیں دنوں تحریر کیے تھے۔